زیور کا ڈبہ
منشی پریم چند


زیور کا ڈبہ
منشی پریم چند

بی اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ ان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب دھرے رہ گئے۔ اور اب گزر اوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی۔ الٹا بھوک کا بوجھ اور سر پر لاد دیا۔ اور بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین، زبان کی طرارہ جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مر جانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس کی نوکری کرتے شرم آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیئے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ پختہ، ہوادار اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انھیں کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے۔ گویا ملازم نہیں گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے

ISBN-81-88881-06-6

قیمت : ۳۰/۰۰ روپے

پہلا ایڈیشن ۲۰۰۳

طباعت : انیس آفسیٹ پرنٹر، نئی دہلی ۲

ناشر : بچوں کی دنیا
۱۰۱۸- سیکٹر ۲۸، فرید آباد ۱۲۱۰۰۸ (ہریانہ)

Delhi office
*Bachon Ki Duniya*
2nd Floor,922,Rooh Allah Street
Daryaganj, New Delhi-110025

دہلی آفس
بچوں کی دنیا
دوسری منزل 922 روح اللہ اسٹریٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مشورہ لیا جاتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پرکاش نے اپنے شاگرد ویراندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا "ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے پرکاش نے دل میں سوچا۔ وہ کیا بات ہے جو ویراندر کے سامنے نہیں کہی جا سکتی۔ پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اوما دیوی نے کہا۔ "تمہاری کیا صلاح ہے، ویرو کا بیاہ کر دوں؟ ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔

پرکاش نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھیے۔"

"نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔"

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا۔ "میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔"

"تو ابھی نہ کروں، تمہاری یہی صلاح ہے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔ میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

"تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے پھر پچھتانا پڑے گا۔ کیوں؟"

"میرے رہتے ہوتے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیے، کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی۔ یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انھیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنھیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہوں میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا ہے۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے، کہیں
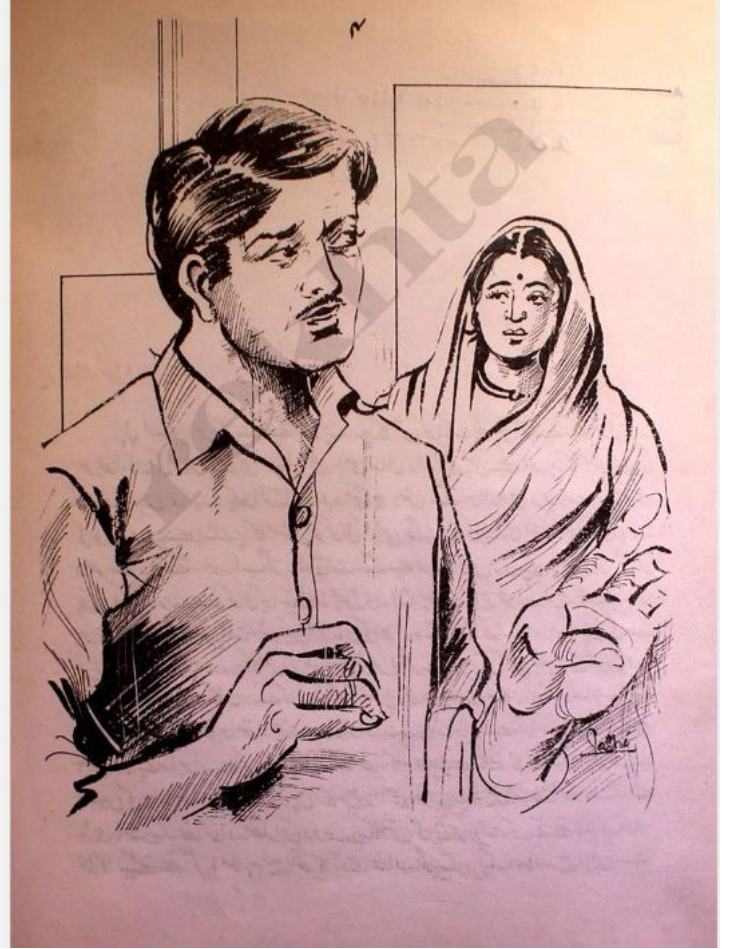
محلہ کا بنیا گھیرے ہوتے ہے۔ کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپے آسانی سے اڑا سکتا تھا۔ اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیور خریدے اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے بولا "ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپے کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں، ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ سچ کہتا ہوں بعض پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی"۔

چمپا حاسدانہ لہجہ میں بولی "اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جنھیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کو پیدا ہوتے ہیں"۔

چندر پرکاش: یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ نہ کمانا نہ دھمانا۔ باپ دادا چھوڑ گئے ہیں مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں۔ ایشور بڑا غیر منصف ہے"۔

چمپا: اپنا مقدر ہے۔ ایشور کا کیا قصور، تمہارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روزمرّہ کا خرچ چلانا مشکل ہے۔ گہنے کپڑے کو کون روئے کوئی ڈھنگ کی ساڑی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں، بیمار پڑ جاتی تو جان بچ جاتی"۔

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلّی دی "ساڑھی تمہارے لیے ضرور لاؤں گا۔ یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہو گی"۔

چمپا مسکرا کر بولی "چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی، گزر ہو جائے، یہی بہت ہے"۔

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور حیا سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوتے تھے۔" اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں مجھے اس کی امید نہ تھی۔"

چمپا نے کہا "کوئی اور بات کرو۔ زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔"

"ویسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔"

"زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے تو ایسی بہت سے عورتیں دیکھی ہیں جو زیور پہن کر بھی بھدّی معلوم ہوتی ہیں۔

"ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار معلوم ہوتے ہیں، یہ نہ ہوا کہ کہتے۔ اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لیے لیتے جاؤ۔"

"تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔"

"اس میں بچپن کی کیا بات ہے۔ کوئی فراخدل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔"

"میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔"

"میں غیر نہیں ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں۔ اگر سو دو سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی۔ مگر اہل ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی۔"

رات کے بارہ بج گئے ہیں پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آتی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آتے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔ یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ یہی تو کھانے پہننے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بچاری کو ہر ایک چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا تھا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اُتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرہ میں چلوں۔ اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا۔ کیا چرکا دیا۔ کہہ دوں گا میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا
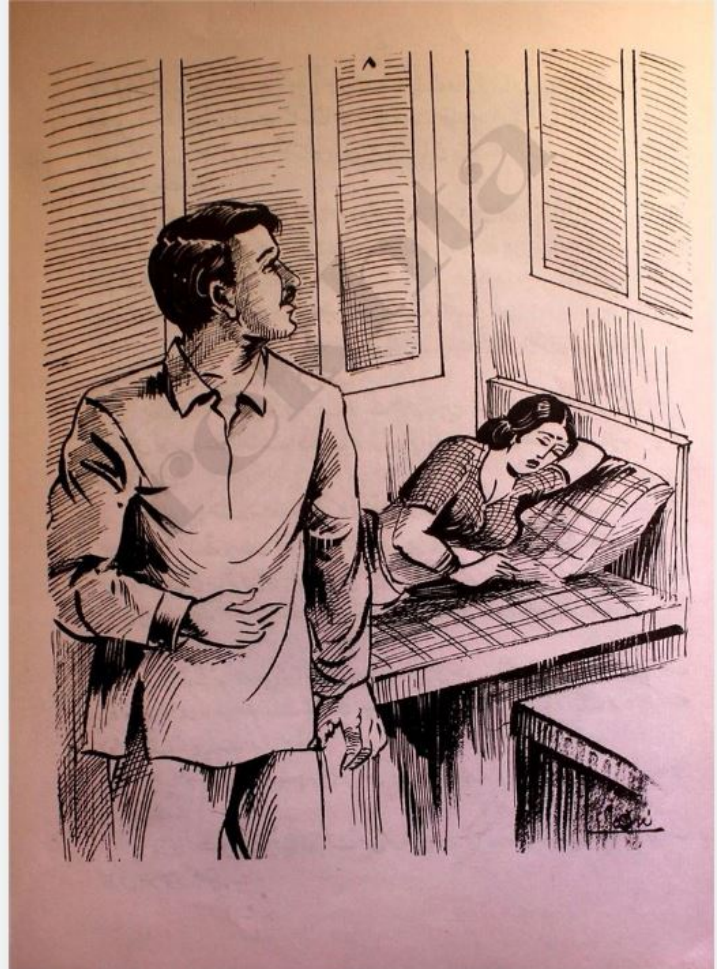
دکھائی دیا اس لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کر رہا ہے۔ کسی کا مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شک کریں گے۔ میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے۔ ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے۔ میں تلوہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔ پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا۔ بڑا غضب ہو گیا۔ رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ چور زیوروں کا ڈبہ اٹھا کر لے گئے۔"

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا "کسی نے پکڑا نہیں چور کو؟"

"کسی کو خبر بھی نہیں۔ چور وہی ڈبہ لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اڑائی اور انھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس صندوق میں زیور کا ڈبہ رکھا ہے۔"

"نوکروں کی کارستانی ہوگی۔ باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔"

"نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔"

"نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ آج موقع دیکھا اڑا لے گئے۔"

"تم جا کر ان کو تسلی دو۔ ٹھکرائن بے چاری رو رہی تھیں۔ تمہارا نام لے کر کہتی تھیں کہ بے چارہ مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور منڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔"

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا۔ یہ تو بڑا غضب ہو گیا ماتا جی۔ مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتلایا۔"

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ بولے "کہیں سیندھ نہیں، کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری۔ سمجھ میں نہیں آتا چور آیا کدھر سے۔"

ٹھکرائن نے روکر کہا۔" میں تو لُٹ گئی بھیا۔ بیاہ سر پر ہے، کیا ہوگا بھگوان۔ تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی تب کہیں جا کر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں۔ نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں"۔

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا۔" مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے"۔

ٹھکرائن نے مخالفت کی۔ ارے نہیں بھیا! نوکروں میں کوئی نہیں۔ دس دس ہزار روپے یونہی ادھر پڑے رہتے ہیں کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا"۔

ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا۔" تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ جس نے ابھی تک چوری نہیں کی وہ چوری نہیں کرے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ مال اڑا دیا ہوگا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے"۔

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہی ہو جائے گا۔ بولے" پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرنا بالکل بے فائدہ ہے"۔

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا" تم بھی کیا بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ تم زد و کوب بھی تو نہیں کر سکتے۔ ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔ مال چلا گیا۔ اب کیا ملے گا"۔

پرکاش : لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

ٹھاکر : کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو جو چپکے چپکے پتہ دے تو البتہ مال نکل آئے۔ لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں۔ نصیبوں کو رو کر بیٹھے رہو اور کیا۔

پرکاش : آپ بیٹھ رہیے لیکن میں بیٹھنے والا نہیں۔ میں انھیں نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا"۔

ٹھکرائن : نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو، پر چور آیا باہر سے۔ تمہارے کوٹھے سے بھی تو آسکتا ہے۔

ٹھاکر : ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟
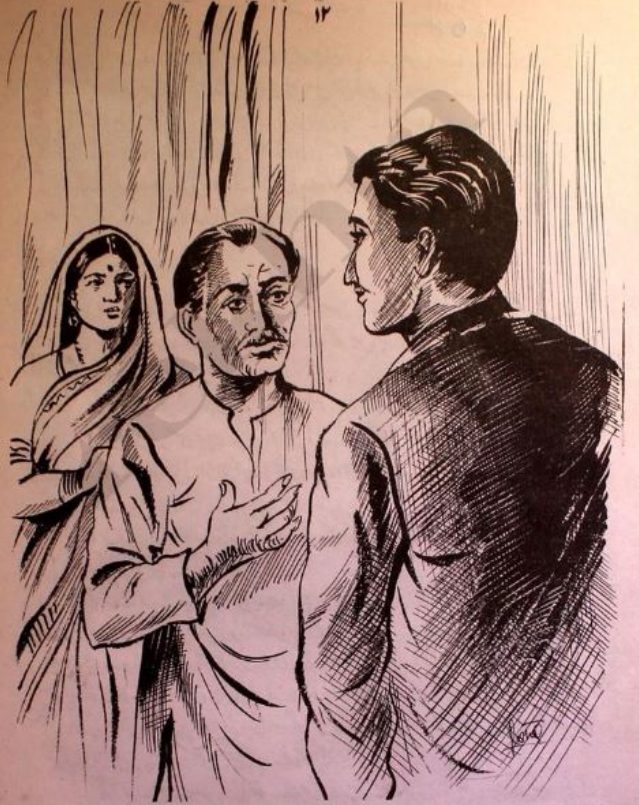
پرکاش کا دل دھڑکنے لگا۔ بولا "میں دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ ہاں کوئی پہلے سے موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔" تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیئے۔ جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا وہاں کا چونا لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیئے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی۔ اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ "ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا۔ مال تو جانا تھا وہ گیا۔ اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپیہ کی کوئی تجویز کرنی ہو گی۔"

پرکاش: میں آج ہی گھر چھوڑ دوں گا۔

ٹھاکر: کیوں؟ ہمیں تمہارا . . . .

پرکاش: آپ نہ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی۔ میرا دروازہ تو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار روز میں پھر آ گھسے۔ گھر میں اکیلی عورت ہے۔ سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانے میں بیٹھی ہے، ادھر کوئی آدمی چپکے سے اوپر چڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھام کر کبھی نو بجے آیا کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ ادھر کا راستہ ہی نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔

ٹھکرائن ڈریں۔ "تم چلے جاؤ گے بھیا تب تو گھر اور پھاڑ کھائے گا۔"

پرکاش: کچھ بھی ہو ماتا جی۔ مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہو گئی اس کا خمیازہ مجھے اٹھانا پڑے گا۔

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا "بڑا لائق آدمی ہے۔ چور ادھر سے آیا یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو کچا ہی کھا جائے۔"

"مار ہی ڈالے۔"

"دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا۔"
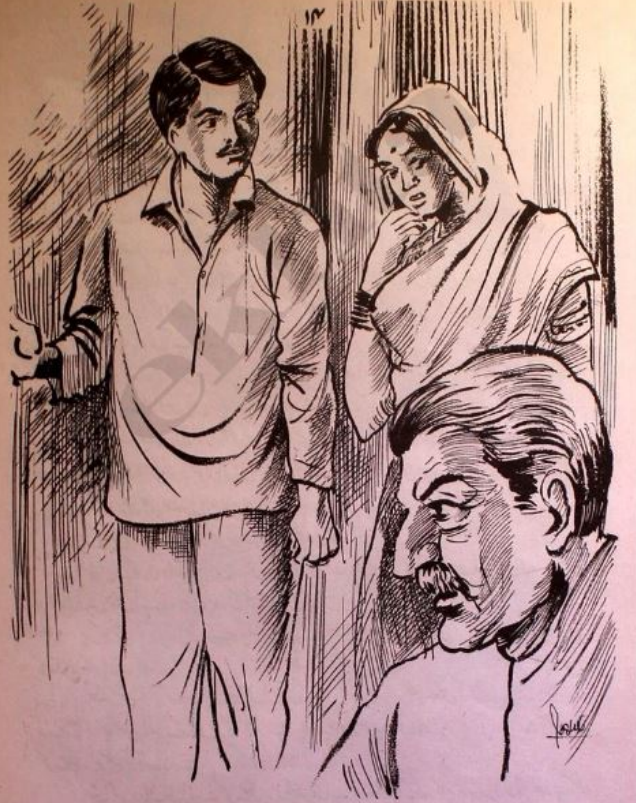
"اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا، کتنا ہی سمجھاؤ۔"

"کرایہ کے بیس روپے دینے پڑیں گے۔"

"ہم کیوں کرایہ دیں؟ وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں۔ ہم کیا کچھ کہتے ہیں۔"

"کرایہ تو دینا ہی پڑے گا۔ ایسے آدمی کے لیے کچھ غم بھی کھانا پڑے تو بُرا نہیں لگتا۔"

"میں تو سمجھتی ہوں کرایہ لیں گے بھی نہیں۔"

"تیس روپے میں گزر بھی تو نہ ہوگی۔"

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے میں خدشہ تھا لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا "ایک سیٹھ جی کے یہاں پچاس روپیہ ماہوار کا کام اور مل گیا ہے مگر وہ روپیہ میں انھیں کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں پر خرچ ہوگی۔ اس میں سے ایک پیسہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا۔ خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پاکر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔ دیوی دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہوگیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک، صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں مگر اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اس کی چابی کہاں تھی۔ اس کا چمپا کو پتہ نہیں۔ وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں "کچھ نہیں پرانی کتابیں ہیں، ماری ماری پھرتی تھیں، اٹھا کے صندوق میں بند کر دی ہیں۔ چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے گئی تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق ہوگیا۔ شبے کا انکھوا سا نکلا مگر پانی نہ پاکر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکتی تھی جس سے شبے کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے پرکاش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر جاتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہوگئی۔ اس دن سے پرکاش کمرہ ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی کے مارے دم گھٹتا تھا۔ چمپا نے باہر سونے کے لیے کہا مگر پرکاش نہ مانا۔ اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے۔

چمپا نے کہا "چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی۔ چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے؟"

پرکاش نے غصہ میں کہا "کچھ نہیں ہے برتن تو ہیں۔ غریب کے لیے تو اپنی ہنڈیا ہی سب کچھ ہے۔"

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوتی دیکھی تو بولا۔

"صندوق تم نے ہٹایا تھا؟"

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی۔ جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں اِدھر اُدھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی "میں کیوں ہٹانے لگی؟"

"پھر کس نے ہٹایا؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"گھر میں تم رہتی ہو تو جانے کون؟"

"اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"کچھ یوں ہی پوچھتا تھا۔"

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی۔ وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے لگی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھما کے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لیے بولا "طشتری میں کیا لائیں؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھی پکوڑیاں ہیں۔"

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ اکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اُٹھا۔ صندوق میں کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بیقرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ تالی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آنکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا۔ ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک زیور نکال کر دیکھا' یہ کہاں سے آگئے۔ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً اس کے دل میں خیال

گذرا یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں، چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اسے اب کوئی شک نہیں رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت کیسے پڑی ؟ یہ کمینی خواہش ان کے من میں آئی کیسے ؟ میں تو کبھی زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری کے زیوروں کے لیے۔ ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا ؟

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے وہ محبت نہ رہی۔ نہ وہ عزّت کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے تھے مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی، مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ مینجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکاؤنٹنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے ؟ پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک روز ٹھاکر صاحب سے اس معاملے پر بات چیت چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا۔ "تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے ؟"

پرکاش نے سر جھکا کر کہا "دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپئے کہاں رکھے ہیں ؟"

"اجی درخواست تو دو۔ اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔"

پرکاش نے حیران ہو کر کہا "آپ ضمانت داخل کر دیں گے ؟"

"ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے ؟"

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی مگر پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر زبردست اعتماد سے اُسے

دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینہ پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوش خبری سنائی۔ چمپا نے سُن کر منہ پھیر لیا۔ پھر ایک منٹ بعد بولی "ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی۔ جگہ نہ ملتی نہ سہی، روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپئے پیسے کا معاملہ ہے، کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمہارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔"

"یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہوگی۔ کیا میں ایسا اناڑی ہوں ؟"

چمپا نے کہا "آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔"

پرکاش سناٹے میں آگیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا مگر ایسی خوش خبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا اس کو کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا، اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے۔ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا؟ اس سوال کا جواب کرنے کے لیے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نظر کر سکتا ہے۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا "تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی ؟ جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا "کچھ نہیں میں نے دنیا کی بات کہی تھی۔"

پرکاش کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا "کیا جتنے آدمی بینک میں ملازم ہیں ان کی نیت بدلتی رہتی ہے ؟"

چمپا نے پیچھا چھڑانا چاہا "تم تو زبان پکڑتے ہو۔ ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی میں ہی تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے۔ سو دو سو روپیہ کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔"

پرکاش کے دل سے بوجھ اتر سا گیا۔ مسکرا کر بولا "اچھا تمہارا اشارہ اس طرف تھا لیکن میں نے کمیشن کے سوائے ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں۔ بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔

چمپا نے نفرت کے لہجہ میں کہا "جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے اس کی آنکھ بچا کر پائی بھی لینا گناہ سمجھتی ہوں۔ تمہاری شرافت جب جانتی کہ تم کمیشن کے روپئے جا کر ان کے حوالے کر دیتے ان چھ مہینوں میں انھوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک کئے کچھ دیا ہی ہے۔ مکان تم نے خود

چھوڑا۔ لیکن وہ بیس روپیہ ماہوار دیتے جاتے ہیں۔ علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے تمہارے ہاں ضرور بھیجتے ہیں۔ تمہارے پاس گھڑی نہ تھی، اپنی گھڑی تمہیں دیدی۔ تمہاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے، خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انھوں نے ادا کی اور دن میں دو بار پوچھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے۔ اپنے رشتہ داروں تک کی ضمانت تو جلدی سے کوئی دیتا نہیں، تمہاری ضمانت کے لیے نقد دس ہزار روپے نکال کر دے دیئے اسے تم چھوٹی بات سمجھتے ہو؟ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپئے توضبط ہو جائیں گے۔ جو آدمی اپنے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لیے ہمیں جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

پرکاش کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا۔ اکٹھا ہو کر گھر سے نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے افسوس۔ چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔ وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔ دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

کئی روز گذر گئے۔ پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ، ویراندر اور اس کی نئی دلہن آئے ہوئے ہیں۔ باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔ پرکاش نے کہا۔ "آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔ دادا میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔ چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی لیکن

پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدے میں۔ تینوں عورتیں اندر کمرہ میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا۔ آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا حرارت سے اضطراب اور خلش سے پُر۔ اب بخار کا اتار تھا سکون، فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹتا تھا، آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویرو کا کمرہ کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبہ رکھ دیا پھر فوراً باہر آکر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا۔ ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھاتے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوتے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی۔ گویا کہ کسی گہرائی، اتھاہ گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبہ کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے۔ اوپر، اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو ویرو سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا۔ دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویراندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ ماسٹر جی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی۔ جو زیورات چوری ہو گئے تھے سب مل گئے۔

ٹھاکر صاحب بھی آگئے اور بولے "بڑی مبارک دعوت تھی تمہاری۔ زیور کا ڈبہ پورا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی۔ جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔"

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آتے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔ کہیں

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری گیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ تعجب کی بات ہے۔ میری عقل تو کام نہیں کرتی۔

ٹھاکر: کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی تمہاری ہی کیوں۔ ویرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے معجزات پر یقین ہو گیا۔

پرکاش: اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔

ٹھاکر: آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی۔

پرکاش: آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوالیا تھا کسی سے . . .

ٹھاکر: کئی پنڈتوں سے۔

پرکاش: تو بس اس کی برکت ہے۔

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوش خبری سنائی۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آگیا ہو۔

پرکاش نے کہا "آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے"۔

"میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی"۔

"تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو"۔

"مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہو گا"۔

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری گیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ تعجب کی بات ہے۔ میری عقل تو کام نہیں کرتی۔

ٹھاکر: کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی تمہاری ہی کیوں۔ دیرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے معجزات پر یقین ہو گیا۔

پرکاش: اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔

ٹھاکر: آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی۔

پرکاش: آپ نے کوئی منتر وتنتر تو نہیں پڑھوا لیا تھا کسی سے . . .

ٹھاکر: کئی پنڈتوں سے۔

پرکاش: تو بس اس کی برکت ہے۔

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوش خبری سنائی۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا "آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے"۔

"میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی"۔

"تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو"۔

"مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہو گا"۔

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔